© rasailojaraid.com

محمد اسحٰق بھٹی

شاہ جی!

اپنی طرز واداء کے واحد انسان

فیروز پور مشرقی پنجاب کا ایک مشہور شہر ہے۔ لاہور میں اس کے نام پر ایک بڑی شاہراہ ہے جو فیروز پور روڈ کہلاتی ہے اور سیدھی فیروز پور جاتی ہے۔ لاہور سے بجانب مشرق یہ شہر پچاس میل کی اور قصور سے پندرہ میل کی مسافت پر دریائے ستلج کے ہیڈ حسینی والا سے چار میل آگے ہے۔ اس شہر کی بنیاد فیروز شاہ سوم کے عہدِ حکومت میں رکھی گئی تھی۔

آزادی سے قبل اس شہر میں کئی سیاسی اور مذہبی جماعتیں قائم تھیں جو اپنی صوابدید کے مطابق خدمات سرانجام دے رہی تھیں، ان میں سے ایک مجلس احرار اسلام تھی۔ فیروز پور شہر اور ضلع میں مجلس احرار سے باقاعدہ تعلق رکنیت رکھنے والے حضرات اگرچہ تعداد میں کم تھے مگر اپنی اپنی جگہ خاص اثر و رسوخ کے مالک اور معاشرتی اعتبار سے باوقار رتبے کے حامل تھے۔ شہر کی مجلس احرار میں مولانا عبید اللہ احرار، خان عبدالعظیم خان، شیخ غلام حیدر ایڈووکیٹ، حکیم احمد علی، مہر محمد علی اور حاجی نظام الدین کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مجلس احرار سے میرا کبھی سیاسی تعلق نہیں رہا لیکن ان سب حضرات سے مراسم تھے۔ پاکستان آنے کے بعد یہ مختلف مقامات میں بکھر گئے۔ عبدالعظیم خاں خانیوال میں، حاجی نظام الدین گوجرانوالہ میں، شیخ غلام حیدر ایڈووکیٹ لاہور میں، حکیم احمد علی کھڈیاں خاص (ضلع قصور) میں اور مولانا عبید اللہ احرار (جو بعد میں پاکستان کی مجلس احرار کے صدرِ منتخب کیے گئے) فیصل آباد میں آباد ہو گئے تھے۔ اب یہ تمام بزرگ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، فقط ان کی یاد باقی رہ گئی ہے جو روح کو تڑپاتی اور دل کو غمگسار کرتی ہے۔

جب تک یہ زندہ رہے، ان سے ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔ بعض کے جنازوں میں بھی بچشم اشکبار شرکت کی اور اس وقت ان کی یادوں نے قلب و ذہن کو شدید جھٹکے دیے ان میں سے بعض کے بیٹوں سے سلسلۂ روابط قائم ہے، جب کسی سے کہیں ملاقات کا موقع ملتا ہے، بہت احترام سے پیش آتے ہیں اور بات شروع ہو جائے تو حافظے کی تہوں میں دبے ہوئے بے تحاشا واقعات اُچھل اُچھل کر نظر و بصر کے زاویوں میں آ جاتے ہیں اور پھر زبان انکے اظہار و بیان کے لیے بیقرار ہو جاتی ہے۔

وہ ہم نشین اور یارانِ محفل بے شک اس دنیا سے رخت سفر باندھ گئے ہیں اور ہمیشہ کے لیے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں، مگر دل کی دنیا میں بدستور آباد ہیں فیضی کا یہ شعر اس صورت حال کی پوری عکاسی کرتا ہے۔

ای ہم نفسان محفل ما اے
رفتید، ولے نہ از دلِ ما

کتنی ہی ایسی ہستیاں اس جہانِ ہست و بود سے یکے بعد دیگرے کوچ کر گئیں جن سے شب و روز کا تعلق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھا اور ان کی زندگی میں کبھی جدائی کا احساس تک نہیں ہوا تھا خیال یہی تھا کہ ہمیشہ اسی طرح رہیں گے اور ہنسی خوشی سے وقت گزرتا رہے گا۔ اب وہ لوگ سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئے ہیں تو آنکھیں کھلی ہیں۔ بعض اوقات تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس بھری پڑی اور ہنستی بستی دنیا میں تنہا رہ گیا ہوں اور زندگی کا لطف ختم ہوگیا ہے۔

زرفتنِ تو من از عمر بے نصیب شوم
سفر تو کردی و من در وطن غریب شوم

فیروز پور کی مجلس احرار کے یہ چند افراد اس شہر کی جان تھے اور وہاں کی سیاسی اور سماجی رونقیں ان کے دم قدم سے پورے جوبن پر تھیں۔

شہر سے چودہ میل کے فاصلے پر سوئے مغرب ایک گاؤں، جو تحصیل فیروز پور میں واقع تھا، "لکھوکے" کے نام سے موسوم تھا۔ اس گاؤں میں کئی پشتوں سے علم کا دریا رواں تھا اور درس و تدریس کے سلسلے جاری تھے۔ اس میں ایک بزرگ مولانا محمد علی لکھوی فروکش تھے جو حضرت حافظ محمد لکھوی (صاحب تصانیف کثیرہ) کے پوتے اور مولانا محی الدین عبدالرحمن لکھوی کے فرزند ارجمند تھے۔ مجاہدانہ فطرت کے مالک اور انگریزی حکومت کے شدید مخالف تھے۔ سرحد پار کی جماعت مجاہدین سے انکے قریبی مراسم تھے۔ کئی مرتبہ خود بھی مرکز مجاہدین میں گئے، جہاد کے لیے بھی بہت سے لوگوں کو وہاں بھیجا، مجاہدین کی مالی امداد بھی کرتے رہے۔ وہ مولانا محی الدین لکھوی اور مرکزی جمعیت اہل حدیث کے امیر مولانا معین الدین لکھوی کے والد گرامی قدر تھے لیکن علم و ادراک کی وسیع وادیوں میں جو رسائی انہیں حاصل تھی وہ انکے لائق احترام صاحبزادوں کے حصے میں نہ آئی

مولانا محمد علی لکھوی جلیل القدر عالم اور ایک فعال متحرک شخصیت تھے۔ انہوں نے ہندوستان کی انگریزی حکومت کی مخالفت کے لیے ۱۹۲۲ء کے پس و پیش اپنی زرعی زمین میں ایک باقاعدہ تربیت گاہ قائم کی تھی جس میں تعلیم کا انتظام بھی تھا اور جہاد کی مشق و تمرین کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اس کا نام انہوں نے "دارالسلام" رکھا تھا یہ تربیت گاہ نہر سے دوسری طرف انکے گاؤں کے قریب تھی۔ بعد ازاں ۱۹۲۶ء کے لگ بھگ یہی کام لکھوکے سے ڈھائی میل کے فاصلے پر شروع کیا گیا۔ اس کے لیے دو مربعے زمین وقف کی گئی تھی اور اسے "مرکز الاسلام" کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ مولانا محمد علی کا مجلس احرار سے باقاعدہ تعلق رکنیت تو نہ تھا، البتہ اس کے جلسوں میں شریک ہوتے اور اس کے اکابر و عمائد سے گہرے روابط رکھتے تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ ہر اس جماعت کے ساتھ ہوجاتے تھے جو برصغیر کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کا اعلان کرتی تھی۔ انکا بہت بڑا حلقہ ارادت اور دائرہ متاثرین تھا۔

انہیں اس غلام ملک میں رہنا پسند نہ آیا تو ۱۹۳۰ء میں ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے اور مسجد نبوی میں درس و تدریس میں مشغول ہوگئے تھے۔ پانچ چھے سال بعد ۱۹۳۶ء میں وطن واپس آئے۔ دو سال یہاں رہے، ۱۹۳۸ء میں پھر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ اس سے نو سال بعد نومبر ۱۹۴۷ء میں اوکاڑہ آئے، جہاں قیام پاکستان کے زمانے میں ان کے اہل و عیال اور اعزہ و اقارب قیام پذیر ہوگئے تھے۔ اس عالم اجل نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اکتوبر ۱۹۴۷ء کو وفات پائی اور مدینہ منورہ میں مدفون ہوئے۔

۱۹۳۸ء میں مولانا کے مدینہ طیبہ جانے کے بعد مرکز الاسلام کی درگاہ اور تربیت گاہ کی انتظامی ذمے داریاں ان کے صاحبزادوں مولانا محی الدین لکھوی اور مولانا معین الدین لکھوی نے سنبھال لی تھیں۔ اب وہاں مجاہدین کی تیاری و تربیت کا سلسلہ تو ختم ہو گیا تھا، البتہ مدرسہ باقاعدہ قائم رہا، جس میں قدیم علوم کی تعلیم بھی دی جاتی تھی اور جدید علوم سے بھی طلبہ کو بہرہ مند کیا جاتا تھا۔ میں وہاں یکم جنوری ۱۹۳۷ء سے آخر سال تک طالب علم کی حیثیت سے۔ مارچ ۱۹۴۳ء سے جون ۱۹۴۷ء تک معلم کی حیثیت سے مقیم رہا۔

۱۹۳۷ء میں مولانا محمد علی لکھوی مرکز الاسلام میں تشریف فرما تھے۔ اس سال کی مئی کے پہلے ہفتے میں فیروز پور کی مجلس احرار کے تین رہنما۔ مولانا عبید اللہ احرار، خان عبد العظیم خان اور حکیم احمد علی، مولانا محمد علی کی خدمت میں آئے اور کہا کہ اب سے پانچ مہینے بعد اکتوبر ۱۹۳۷ء میں ہم فیروز پور میں مجلس احرار کا جلسہ منعقد کرنا چاہتے ہیں، آپ سے درخواست ہے کہ اس میں ہماری رہنمائی فرمائیں اور ضلع فیروز پور کے قصبات و دیہات میں جلسے کی تشہیر کا اہتمام کریں۔

مولانا نے ان کی بات سنی اور درخواست منظور فرمائی۔ ان کے بڑے صاحبزادے مولانا محی الدین لکھوی پنجابی کے اچھے شاعر ہیں، انہیں جلسے کی تشہیر کے لیے دو تین پنجابی نظمیں لکھنے کا حکم دیا اور طلبہ کی دو ٹولیاں بنا دی گئیں ایک کا قائد محی الدین کو اور ایک کا معین الدین کو مقرر کیا گیا۔ سب کے لیے لال رنگ کی ایک ایک قمیص سلائی گئی۔

مئی کا مہینہ، سخت گرمی کا موسم، ہم نے لال رنگ کی قمیصیں پہنیں اور احرار کے جلسے کی تشہیر کے لیے چل کھڑے ہوئے۔ گاؤں گاؤں پیدل جاتے، اچھی سی آواز والا کوئی لڑکا نظم کا ایک شعر پڑھتا اور پھر سب لڑکے اس کے پیچھے پیچھے اس شعر کو دہراتے۔ اس طرح ہم ہر گاؤں کی گلی گلی گھومتے، عورتیں گھر کے دروازے میں کھڑی ہو کر اور مرد باہر نکل کر ہمیں دیکھتے اور بچے ہمارے ساتھ چل پڑتے۔ جس گاؤں میں دوپہر ہو جاتی، وہاں کی مسجد میں چلے جاتے، لوگ گھروں سے روٹیاں لا کر ہمیں کھلاتے اور لسی پانی پلاتے، ظہر کی نماز کے بعد اگلے گاؤں کا قصد کر لیا جاتا، جس گاؤں میں رات پڑتی، وہاں کی مسجد میں ڈیرے ڈال دیتے۔ روٹی پانی کا انتظام اس گاؤں کے لوگ کرتے، عشاء کے بعد مجمع اکٹھا ہو جاتا تو پہلے پنجابی نظم پڑھی جاتی، پھر ہمارا قائد تقریر کرتا صبح کو لسی پانی کے بعد پھر سلسلہ سفر شروع ہو جاتا۔

نظموں اور تقریروں میں انگریزی حکومت کے مظالم بیان کیے جاتے، انگریز دشمنی کی پاداش میں مجلس احرار سے تعلق رکھنے والوں کو جن اذیتوں میں مبتلا کیا گیا یا مبتلا کیا جا رہا تھا، انکی وضاحت کی جاتی۔ اس طرح کچھ عرصہ ہم نے مجلس احرار اور اس کے قائدین و زعما کے فضائل و مناقب کی تفصیلات بیان کرنے میں صرف کیا اور اپنی ہمت کے مطابق لوگوں کو اس کے جلسے میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہونے کی تلقین کی۔

مولانا محی الدین اور معین الدین پنجاب کے مشہور علمی اور روحانی خاندان کے فرزند اور بڑے باپ کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بیٹے تھے، جن کا خاندانی اور ذاتی اعتبار سے اس علاقے میں بہت اثر تھا، اس لیے وہ جس گاؤں میں جاتے، لوگ عزت واحترام سے پیش آتے، ساتھ ہمارا بھی داؤ لگ جاتا اور ہمیں بھی "مستحق تکریم" گردانا جاتا۔ یعنی ان کے طفیل، ہم طفیلی موج میں رہتے۔ یہاں طفیل اور طفیلی کو انہی معنوں میں لیا جائے، جن میں یہ استعمال ہوتے ہیں۔ طفیلی کو طفیل کی مؤنث اور طفیل کو طفیلی کا مذکر نہ سمجھا جائے۔

اس وقت میری عمر بارہ تیرہ سال کی تھی۔ اب اس عمر میں وہ حالات یاد آتے ہیں تو خیال کرتا ہوں کہ ہمیں اپنے مقصد میں بہت کامیابی ہوئی تھی۔ ہم جہاں جاتے لوگ ہم سے تعاون کرتے اور غور سے ہماری بات سنتے اور متاثر ہوتے، جلسے میں شرکت کا یقین دلاتے۔

پندرہ بیس روز کے بعد ہم مرکز الاسلام واپس آئے اور اپنی کارکردگی کی رپورٹ مولانا محمد علی لکھوی کو پیش کی تو وہ نہایت خوش ہوئے اور ہماری حوصلہ افزائی کی۔ وہ زندہ دل اور خوش مزاج عالم دین تھے۔ ہر لڑکے سے الگ الگ اس کی کارکردگی کے بارے میں پوچھا اور اپنے خاص انداز سے اس کو شاباش دی۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

اکتوبر ۱۹۳۰ء کو جلسے سے ایک دن پہلے مولانا محمد علی لکھوی کی قیادت میں احرار رضاکاروں کی طرح سرخ قمیصیں پہنے ایک بڑے جلوس کی شکل میں ہم فیروز پور پہنچے اور نعرے لگاتے ہوئے جلسے کے میدان میں داخل ہوئے۔ مولانا محمد علی اسی لباس میں تھے جو وہ ہمیشہ پہنتے تھے، یعنی سفید کھدر کی قمیص، کھدر کا سفید عمامہ اور کھدر کا تہبند ہر ضلع کے لیے الگ الگ کیمپ لگائے گئے تھے، ہمارا بھی ایک کیمپ تھا۔

احرار رضاکار سرخ قمیص کے ساتھ ایک صاف ستھری چمکتی دمکتی کلہاڑی ہاتھ میں رکھتے تھے، لیکن ہمارے پاس کلہاڑیاں نہیں تھیں۔ مجلس احرار کے بعض اکابر بھی سرخ قمیص پہنتے اور ہاتھ میں کلہاڑی رکھتے تھے۔

عشاء کی نماز کے بعد جلسہ شروع ہونے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ اسی دن جلسے کے میدان میں نماز عصر کے بعد مجھے پہلی مرتبہ حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ کسی نے آواز دی، وہ دیکھو شاہ جی گھوم رہے ہیں، میں دوڑ کر گیا اور انتہائی شوق اور مسرت کے ساتھ شاہ جی کو دیکھا۔ پورا قد، گٹھا ہوا جسم، سرخ وسفید رنگ، موٹی موٹی چمکدار آنکھیں، سیاہ اور سفید بالوں پر مشتمل داڑھی جو نہایت خوبصورتی سے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔ کھدر کی سرخ رنگ کی قمیص، سر پر قدرے اونچی دیوار کی قراقلی ٹوپی جس سے ان کے پٹے باہر جھانک رہے تھے، پاؤں میں پشاوری چپل۔ ہاتھ میں کلہاڑی، جس کا دستہ انکی کمر کے برابر تھا اور خاکی رنگ کی ٹخنوں سے ذرا اونچی شلوار! وہ چل پھر کر جلسہ گاہ کا جائزہ لے رہے تھے مولانا محمد علی لکھوی بھی ادھر آ نکلے۔ وہ مصافحے کے لیے شاہ جی کی طرف بڑھے شاہ جی بھی تیزی سے ان کی جانب آئے اور دونوں بزرگ بغلگیر ہو گئے۔ پھر گرمجوشی سے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا اور ایک دوسرے سے خیر خیریت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پوچھی۔ اس موقع پر مولانا مظہر علی اظہر، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، شیخ حسام الدین اور چند اور لوگ ان کے ساتھ تھے۔ وہ بھی احترام اور تپاک سے مولانا لکھوی سے ملے۔ اسکے بعد یہ حضرات بعض مقامی اصحاب کی رفاقت میں پنڈال میں داخل ہو گئے اور گھوم پھر کر انتظامات کا جائزہ لینے لگے۔

یہ اولین موقع تھا کہ میں شاہ جی کے دیدار سے بہرہ مند ہوا۔ وہ سر سے پاؤں تک مردانہ حسن کے اوصاف سے متصف تھے اور اپنے اندر بڑی کشش رکھتے تھے۔ نظیری کا یہ شعر ان پر حرف بحرف صادق آتا ہے۔

زفرقِ تابقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

آج جبکہ یہ سطور لکھی جارہی ہیں، اس واقعہ پر باون برس کا طویل عرصہ بیت چکا ہے، مگر وہ منظر اب بھی آنکھوں کے سامنے ہے اور لیل و نہار کی بہت سی خوش گوار اور ناخوشگوار کروٹوں کے باوجود حافظے نے ان کے اس وقت کے حلیے اور ہیئت کذائی کا کوئی گوشہ فراموش نہیں کیا۔ ہر چیز کو نہایت احتیاط سے محفوظ کر رکھا ہے۔

بھرِ تسکیں دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر
وہ جو وقتِ نازکی جنبش ترے ابرو میں تھی

مجلس احرار کے فیروز پور کے اس جلسے میں ہزاروں افراد کا مجمع تھا۔ شہر اور ضلع کے قصبات و دیہات سے کثیر تعداد میں لوگ احرار مقرروں کی تقریریں سننے آئے تھے۔ شہر سے جانب مغرب چار میل کے فاصلے پر دریائے ستلج کا حسینی والا ہیڈ عبور کرتے ہی لاہور کا ضلع شروع ہو جاتا تھا جو اب ضلع قصور کہلاتا ہے، اس نواح کے بہت سے لوگ شریک جلسہ ہوئے تھے اور وسیع پنڈال میں ہر طرف انسانوں کے سر ہی سر دکھائی دیتے تھے۔

بڑے چھوٹے تمام احراری شاہ جی کی زندگی میں بھی "شاہ جی" کہتے تھے، اب بھی شاہ جی کہتے ہیں نہ کوئی شاہ صاحب "کہتا تھا اور نہ فرطِ احترام سے ان کا نام لیتا تھا۔ جب کوئی احراری "شاہ جی" کہے تو سمجھ لیجئے، اس سے سید عطاء اللہ شاہ بخاری مراد ہیں۔

یہاں یہ یاد رہے کہ میرے مسلک کی رو سے "تقلید" جائز نہیں، لیکن میں اس سلسلے میں "مقلد" ہوں عجیب بات یہ ہے کہ مقلد کسی امام فقہ کا نہیں، احراریوں کا۔! جن کے نقطۂ نظر سے مجھے کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ مگر شاہ جی کا ذکر کرنے لگا ہوں تو مجبور ہوں کہ ان کی "تقلید کا قلادہ" اگر اپنے فکرو خیال کے دامن سے وابستہ نہیں کر سکتا اور اپنی گردن میں نہیں ڈال سکتا تو قلم کی "گردن" میں ضرور ڈال دوں چنانچہ ان کی تقلید کرتے ہوئے میں نے ہر جگہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری یا شاہ صاحب کے بجائے شاہ جی لکھا ہے۔

عشاء کی نماز سے کم و بیش ڈیڑھ گھنٹے بعد ایک اچھے خاصے مجمع کے ساتھ شاہ جی جلسہ گاہ میں داخل ہوئے۔ امیر شریعت زندہ باد، مجلس احرار زندہ باد اور نعرہ تکبیر سے فضا گونجنے لگی۔ سٹیج پر بیٹھے ہوئے تمام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اکابر ایکدم کھڑے ہو گئے۔ سٹیج اِتنا اونچا تھا کہ پانچ چھ سیڑھیاں چڑھ کر اس کے اوپر جانا پڑتا تھا۔ شاہ جی نے سٹیج پر کھڑے ہو کر چاروں طرف نگاہ ڈالی اور پھر ایک کرسی پر جو خاص طور پر ان کے لیے رکھی گئی تھی، تشریف فرما ہوئے۔

سیرے خیال میں رات کے گیارہ بجے کے لگ بھگ وہ تقریر کے لیے مائک پر آئے اور پھر نعرے بلند ہونے لگے۔ ہاتھ کے اشارے سے انہوں نے نعروں کا سلسلہ بند کرایا اور ایک انداز خاص سے دائیں بائیں دیکھ کر مائک کو ذرا اپنے قریب کیا اور خطبۂ مسنونہ کے الفاظ سامعین کے پردہ سماع سے ٹکرانے لگے۔ نہایت دل کش اور رسیلی آواز خطبے کے مضمون سے جب آواز کا زیرو بم ہم آہنگ ہوتا تھا تو لوگ جھوم جھوم جاتے تھے۔ پھر جب درود شریف پڑھنا شروع کیا اور

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ

کے الفاظ ان کی زبان سے ادا ہوئے تو اس میں کچھ اور ہی لطف پنہاں تھا۔ اس وقت عقیدت و انکسار کے تمام لوازم انکی ذات اور زبان میں جمع ہو گئے تھے۔ اس کے بعد جب آیات قرآن کی تلاوت کا آغاز ہوا تو ساکت و صامت فضا میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ آیات براہ راست آسمان سے نازل ہو رہی ہیں سبحان اللہ! ان اوصاف کا حامل شخص اب کہاں پیدا ہو گا۔

انکی تقریر متعدد مسائل پر مشتمل تھی۔ وہ انگریزی حکومت کے خلاف خوب برسے، مرزائیت کی تردید میں ان کا اپنا ایک اسلوب تھا جس کا نہایت مؤثر طریقے سے اظہار کیا، مسئلۂ توحید کی وضاحت کی، اقسام شرک کو موضوع بحث ٹھہرایا اور قرآن کی بہت سی آیات تلاوت کیں اور ان کا ترجمہ سنایا۔ اس زمانے میں مجلس احرار نے حکومت الٰہیہ کا نعرہ بلند کیا تھا شاہ جی نے اسے بھی منقح کیا۔ کئی گھنٹے تقریر جاری رہی۔ ادھر مؤذن نے فجر کی اذان شروع کی اور اللہ اکبر کہا، ادھر مقرر نے خاموشی اختیار کر لی اور تقریر ختم ہو گئی۔

اس سے تقریباً تیرہ مہینے بعد ۱۹۳۸ء کے آخر میں دلی میں شاہ جی کی تقریر سننے کا شرف حاصل ہوا۔ جن حضرات کو دلی جانے اور اس شہر کو دیکھنے کا موقع ملا ہے، اور وہاں کی جامع مسجد بھی دیکھی ہے، میں یہاں ان کو جلسے کا محل وقوع بتانے کی کوشش کروں گا۔

دلی کی جامع مسجد (جسے شاہ جہانی مسجد بھی کہا جاتا ہے) کے بڑے دروازے کے سامنے بہت بڑا میدان ہے، اسی میدان میں ہرے بھرے کا مزار ہے، یہیں سرمد کی قبر، مولانا شوکت علی کا مدفن اور مولانا ابوالکلام آزاد کی آخری آرام گاہ ہے۔ میدان کے اختتام پر لال قلعے کا دروازہ ہے اور یہ وہی قلعہ ہے جو مغل شہنشاہ شہاب الدین محمد شاہ جہان نے تعمیر کرایا تھا۔ قلعے کی فصیل کے ساتھ ایک خاصی چوڑی سڑک ہے جس پر بے شمار گاڑیاں چلتی ہیں جو لوگوں کو مختلف مقامات پر پہنچاتی ہیں۔

جامع مسجد کے جنوب میں اردو بازار ہے۔ میں دلی میں شاہ جی کے جس جلسے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، اس کا سٹیج اردو بازار کے قریب تھا اور بازار مقرر کی پشت کی جانب تھا۔ ان کے بائیں جانب جامع مسجد اور دائیں جانب لال قلعہ تھا۔ ان کے سامنے وسیع میدان میں لوگوں کا بہت بڑا مجمع تھا۔ یہ جلسہ جمیعت علمائے ہند کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زیر اہتمام منعقد ہوا تھا۔ شاہ جی کی تقریر عشاء کی نماز کے بعد شروع ہوئی تھی۔ تقریر میں سیاسیات بھی تھیں اور مذہبیات بھی۔!

لوگ اس طرح خاموش اور ہمہ تن گوش بیٹھے تھے کہ

كَأَنَ عَلىٰ رَؤسِهِمُ الطيور

جیسے انکے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں، جونہی سر ہلا، پرندے اڑے۔۔۔ شاہ جی کہہ رہے تھے، آزادی کا مطالبہ کرنا اور اپنے ملک کو ظالم کے پنجے سے چھڑانے کے لیے عمل و حرکت کے میدان میں اترنا مسلمان کا مذہبی فریضہ ہے۔ مطالبۂ آزادی کے مقابلے میں یہ پکڑ دھکڑ، یہ قید و بند یہ سزائیں، یہ پھانسیاں میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتیں مجھے آزادی سب چیزوں سے عزیز ہے دلی والو۔! جس صورت میں آزادی ملے اور جن مشکلات سے گزر کر ملے، اسے حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا میری زندگی کا نصب العین ہے۔۔۔ اس کے بعد جب انہوں نے دونوں ہاتھ ملا کر اور ہتھیلیاں اس انداز سے حاضرین کی طرف بڑھا کر جیسے پانی سے گزرنے کا راستہ بنا رہے ہوں، پنجابی کا یہ شعر پڑھا۔

جے ہیر سمندروں پار ہووے
بکاں نال سمندر نوں چھٹ سٹاں

تو مجمع کے سکوت کا بند ٹوٹ گیا۔ بیٹھے ہوئے لوگ داد و تحسین کے انداز میں اُچھلنے لگے، جبّہ و دستار میں ملبوس علمائے کرام تڑپ اٹھے، واہ واہ کی صدائیں بلند ہونے لگیں اور "امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ باد" کے نعرے پنڈال میں لہرانے لگے۔

ظاہر ہے دلی کے سامعین میں سے بہت کم لوگوں نے پنجابی کے اس شعر کے معنی سمجھے ہوں گے مگر شاہ جی نے جس اسلوب، جس ہیئت اور جس جذبے سے شعر پڑھا اور جس طرح دونوں ہاتھوں کو باہم ملا کر اسے عملی شکل میں ڈھالا۔ اس نے شعر کے ایک ایک لفظ کے مطلب کو نکھار دیا تھا۔

سامعین کی زبانوں سے "واہ واہ" کا لفظ سن کر شاہ جی نے کہا، میں تقریر کرتا ہوں تو کہتے ہیں، واہ شاہ جی واہ۔! جیل میں بند کر دیا جاتا ہوں تو کہتے ہیں، آہ شاہ جی آہ۔! میں واہ اور آہ کے درمیان پھنسا ہوا ہوں۔

ستمبر ۱۹۳۹ء کو یورپ میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی جو ستمبر ۱۹۴۵ء تک چھ سال جاری رہی۔ انگریز کی مخالفت کی پاداش میں ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے زعما و قائدین کو گرفتار کر کے حکومت نے ملک کے مختلف جیل خانوں اور قلعوں میں بند کر دیا تھا۔ لڑائی ختم ہونے کے بعد انہیں رہا کیا گیا تو برطانیہ کی توپ و تفنگ کی جنگ جیتنے والی حکمران جماعت کنزرویٹو پارٹی اپنے ملک میں ووٹ کی جنگ ہار چکی تھی اور اس کی جگہ لیبر پارٹی برسر اقتدار آ گئی تھی جس کے وزیر اعظم مسٹر اٹیلی تھے۔ انہوں نے مارچ ۱۹۴۶ء میں ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں ملک کے سیاسی رہنماؤں سے گفتگو کے لیے برطانوی کابینہ کا ایک سہ رکنی وفد ہندوستان بھیجا جو اے وی الیگزینڈر، سٹیفورڈ کرپس اور لارڈ پیتھک لارنس پر مشتمل تھا، اسے کیبنٹ مشن کہا جاتا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہاں اس سلسلے کی تفصیل میں جانا مقصود نہیں، اختصار کے ساتھ صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ملک کے سیاسی لیڈروں سے گفت و شنید کے بعد حکومت ہند نے ملک میں عام انتخابات کے انعقاد کا اعلان کردیا تھا۔ میں اس وقت مرکز الاسلام (ضلع فیروز پور) میں خدمت تدریس انجام دیتا تھا اور عمر کی بیسویں منزل میں داخل ہو چکا تھا۔ ایک دن اخبار میں پڑھا کہ کل رات امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری قصور تشریف لا رہے ہیں جہاں وہ جلسۂ عام میں تقریر کریں گے میں نے اور مولانا معین الدین لکھوی نے قصور جانے اور شاہ جی کی تقریر سننے کا پروگرام بنایا۔ یہ ۱۹۴۶ء کی بات ہے۔

ہم قصور پہنچے تو فیروز پور اور دیگر مقامات کے بہت سے لوگ مل گئے جو شاہ جی کی تقریر سننے آئے تھے (طویل عرصے کے بعد شاہ جی اس نواح میں تشریف لائے تھے۔ شب کو نو بجے کے بعد ان کی تقریر شروع ہوئی اور چار گھنٹے جاری رہی۔ شدید سردی کا موسم تھا اور ہم نے کمبل اوڑھ رکھے تھے۔ وہ ملک میں انتخابات کے ہنگاموں کے دن تھے اور مسلم لیگ کی طرف سے وہاں کے دیہاتی حلقے میں میاں افتخار الدین انتخاب لڑ رہے تھے جو کچھ عرصہ پہلے کانگریس چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔ شاہ جی نے انگریزی حکومت کی نہایت سخت لب و لہجے میں مخالفت کی اور عالم اسلام اور ہندوستان پر اس کے مظالم تفصیل سے بیان کیے مسلم لیگ کو بھی ہدف تنقید ٹھہرایا اور اس کے سیاسی نقطۂ نظر کا تجزیہ کیا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ دور تک پھیلا ہوا انسانوں کا یہ ہجوم شاہ جی کی مٹھی میں ہے اور ان کی پرجوش خطابت نے ان کو پوری طرح مسحور کر دیا ہے۔ انہوں نے بعض جماعتوں کے قائدین کی حکمت عملی کو بھی موضوعِ بحث بنایا اور اسلام سے متعلق ان کے قول و فعل کے تضادات کا جائزہ لیا۔ پھر اسلامی تعلیمات کی خصوصیات کا ذکر کیا۔

میں نے دیکھا کہ تقریر کے دوران شاہ جی ننگے سر تھے۔ نہ سر پہ ٹوپی تھی نہ کپڑا۔ ان کے سفید گھنگھریالے بال عجب بہار دکھا رہے تھے۔ سنا ہے شاہ جی نے اسوقت سے ٹوپی اتار دی تھی، جب انہیں پتا چلا تھا کہ جالندھر ریلوے اسٹیشن پر مولانا حسین احمد مدنی کی پگڑی اچھالی گئی ہے۔

یہ حادثہ اس وقت پیش آیا تھا جب مولانا حسین احمد مدنی صوبہ سرحد اور پنجاب کے دورے سے بذریعہ ٹرین دیوبند جا رہے تھے۔ ٹرین جالندھر اسٹیشن پر پہنچی تو چند مسلم لیگی نوجوان اپنے ایک ساتھی شمس الحق کی معیت میں وہاں آئے۔ مولانا کو برا بھلا کہا، ان کی پگڑی اتار لی، طمانچہ مارا اور گالیاں دیں۔ اس حادثے کے بعد شاہ جی پہلی مرتبہ امرتسر کے ایک جلسے میں ننگے سر آئے تھے۔ فرمایا، جب سے میری قوم نے حسین احمد کی پگڑی اتاری ہے، میں نے عہد کیا ہے، آئندہ سر پر ٹوپی نہیں رکھوں گا۔

شورش کاشمیری نے اس حادثے کے متعلق اپنی کتاب ''بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغ محفل'' (مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء) کے صفحہ ۲۷۶ کے حاشیے میں لکھا ہے:

''ہمارے ایک دوست ڈاکٹر اکرام الحق قریشی جالندھر میں لیگ کے پرجوش کارکن تھے حمید نظامی مرحوم کے کلاس فیلو رہے۔ ان کا بیان تھا کہ شمس الحق اپنے اس کارنامے کا کروفر لے کر مولانا عظامی کے ہاں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پہنچا۔ وہ ان دنوں مقامی لیگ کے نائب صدر تھے۔ مولانا عظامی واقعہ سن کر کانپنے لگے۔ بار بار پوچھتے واقعی تم نے یہی کیا ہے؟ کہنے لگے۔ میاں! جس نے حسین احمد کے ساتھ یہ کیا ہے اس کی تو نعش بھی نہیں ملے گی۔ سب کو معلوم ہے کہ شمس الحق پاکستان آ کر قتل ہو گیا، اسکی نعش تک نہ ملی، بلکہ معمہ ہی رہی۔ اس کا دوسرا ساتھی مہاجرت کے وقت دریائے بیاس میں ڈوب گیا"۔

اس حادثے کی تفصیل بعض عینی شاہدوں کے حوالے سے پاکستان کے ممتاز و مشہور عالم اور خطاط جناب سید انور حسین صاحب (نفیس رقم) نے چارسدہ (پشاور) کے ایک ماہانہ رسالے "النصیحہ" کے مئی ۱۹۸۶ء کے شمارے میں تحریر فرمائی ہے جو نہایت دردناک اور دل ہلا دینے والی ہے۔ جن لوگوں نے جالندھر ریلوے اسٹیشن پر مولانا مدنی کی اہانت کا ارتکاب کیا تھا، بقول محترم مضمون نگار کے "اس مجمع کے سرغنہ شمس الحق عرف شمسی، فضل محمد اور فتح محمد تھے۔" ان کا جو انجام ہوا اور جن اذیت ناک حالات سے وہ گزرے ان کے تمام پہلو بدرجہ غایت عبرت ناک ہیں۔ ان کو پڑھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے اور پتا چلتا ہے کہ اللہ کی گرفت بڑی شدید ہے جس سے محفوظ رہنے کی ہر وقت دعا کرنی چاہیے۔ سید انور حسین (نفیس رقم) کے اس مضمون کا عنوان ہے "شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے آخری سفر پنجاب کی روح فرسا روداد۔ عبرت انگیز نتائج۔ ثقہ راویوں کی زبانی"۔

شاہ جی جیسا بے خوف مسلسل کئی کئی گھنٹے بولنے والا، اپنے نقطۂ فکر کے اظہار میں مخلص اور زور دار خطیب برصغیر نے پیدا نہیں کیا۔ وہ ایک خاص طرز و اداء کے واحد مقرر تھے جو اپنی تمام خوبیاں اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ ان کی خطیبانہ اداؤں کو بعض لوگوں نے اپنانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

۱۹۴۶ء میں جب کیبنٹ مشن ہندوستان آیا تھا، شاہ جی دلی گئے اور ایک رات جامع مسجد کے سامنے والے میدان میں بہت بڑے اجتماع کو خطاب کیا۔ ان کی تقریر ہو رہی تھی کہ پنڈت جواہر لال نہرو، کیبنٹ مشن کے ایک رکن مسٹر سٹیفورڈ کرپس کو وہاں لے گئے کرپس چند منٹ جلسہ گاہ کے ایک کونے میں کھڑا انکی تقریر سنتا رہا۔ وہ کچھ سمجھ نہیں سکتا تھا، لیکن مقرر کی حرکات و سکنات اور جوش و جذبہ و حاضرین کی تاثر پذیری کا اندازہ کر کے اس نے جواہر لال نہرو سے کہا کہ جو ملک اس قسم کے سیاسی مقرر اور خطیب رکھتا ہو، وہ آخر کب تک غلام رہ سکتا ہے پھر اس نے کہا: یہ شخص شکل و صورت کے اعتبار سے "فادر" معلوم ہوتا ہے۔

اگست ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہو گیا اور پاکستان نقشۂ عالم پر ابھر آیا۔ ہم لوگ اپنے آبائی وطن کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ) کی سکونت ترک کر کے چک نمبر ۵۳ گ ب تحصیل جڑانوالہ ضلع لائل پور (حال فیصل آباد) آ گئے ٹھیک سے یاد نہیں رہا، اسی سال کے آخر یا ۱۹۴۸ء میں لائلپور میں مجلس احرار کا جلسہ ہوا۔ اس جلسے کا اہتمام مولانا عبید اللہ احرار نے (جو فیروز پور سے لائل پور جا بسے تھے) مولانا تاج محمود اور دیگر احرار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوستوں نے کیا تھا۔ میرے گاؤں کے بہت سے لوگ جلسہ سننے گئے۔ میں بھی گیا۔ رات کو اس جلسے میں شاہ جی نے بھی تقریر کی اور شورش کاشمیری نے بھی۔!

شورش نے اس زمانے میں ہفت روزہ "چٹان" جاری کر رکھا تھا اور وہ مجلس احرار سے الگ ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ انکے علاوہ دوسرے زعمائے احرار نے بھی تقریریں کیں، لیکن سب کی تقریریں ڈھیلی تھیں اور لہجے مرجھائے ہوئے تھے۔ وہ جذبہ، وہ جوش، وہ تند و تیز اسلوب جو احرار مقرروں کا خاصا تھا، مفقود تھا۔

کوئی زمانہ تھا کہ لاہور میں یا کسی اور جگہ اعلان ہوتا کہ شاہ جی رات کو دس بجے تقریر کریں گے تو لوگ پانچ بجے ہی رات کا کھانا اور پانی لے کر جلسہ گاہ میں پہنچ جاتے اور فجر کی اذان تک ان کی تقریر سے محظوظ ہوتے رہتے۔ مگر لائل پور کے اس جلسے میں ہم نے دیکھا کہ شاہ جی کی تقریر سامعین کے دلوں میں گرمی نہ پیدا کر سکی۔

۱۹۵۲ء کے آخر میں مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کی تحریک شروع ہوئی۔ اس کے لیے ایک مجلس عمل (ایکشن کمیٹی) بنائی گئی تھی جس کے صدر مولانا سید ابوالحسنات قادری اور ناظم اعلیٰ مولانا سید داؤد غزنوی کو منتخب کیا گیا تھا۔ ۱۹۵۳ء کے شروع میں مجلس عمل کے تمام ارکان (مولانا داؤد غزنوی کے سوا) گرفتار کر لیے گئے تھے اور لاہور میں مارشل لاء لگا دیا گیا تھا۔ اس کا ایڈمنسٹریٹر جنرل اعظم خان کو مقرر کیا گیا تھا۔ یہ پہلا مارشل لاء تھا جس سے پاکستان کے لوگ آشنا ہوئے۔ اس کے بعد مارشل لاؤں کی قطاریں لگ گئیں۔ اس اعتبار سے لاہور کے مارشل لاء کو آئندہ مارشل لاؤں کی ریہرسل بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور تمہید بھی۔!

میں ان دنوں جماعت اہل حدیث کے ترجمان ہفت روزہ "الاعتصام" کا ایڈیٹر تھا اور مولانا داؤد غزنوی مرکزی جمعیت اہل حدیث کے صدر تھے۔ مجلس عمل کی چند میٹنگیں مرکزی جمعیت اہل حدیث کے دفتر (شیش محل روڈ) میں بھی ہوئیں جن میں مجھے شرکت کا موقع ملا اور میں نے ان سب حضرات کو قریب سے دیکھا اور سنا۔ فیصلہ کیا گیا تھا کہ گرفتاریوں تک نوبت پہنچے تو مولانا داؤد غزنوی گرفتاری سے بچنے کی کوشش کریں تاکہ تحریک کی رفتار بند نہ ہو اور کسی نہ کسی شکل میں عمل و حرکت کا سلسلہ جاری رہے۔

جن حضرات کو حکومت نے ابتداء ہی میں گرفتار کر لیا تھا ان میں شاہ جی بھی شامل تھے۔ ان لوگوں کو کراچی میں گرفتار کیا گیا تھا اور پھر سکھر جیل میں لایا گیا تھا۔ اس سے کچھ عرصہ بعد جسٹس محمد منیر اور جسٹس ایم۔ آر کیانی کی عدالت میں انکوائری شروع ہوئی، تو انہیں سنٹرل جیل لاہور منتقل کر دیا گیا تھا۔ کئی سال ہوئے سنٹرل جیل کو منہدم کر دیا گیا ہے۔ اب یہ لاہور کا شاندار اور فیشن ایبل علاقہ ہے جسے شادمان کالونی کہا جاتا ہے۔

۱۹۵۳ء کے مارچ کے پہلے ہفتے کی کوئی تاریخ تھی کہ مولانا داؤد غزنوی نے ان حضرات سے جیل میں ملاقات کا پروگرام بنایا، مجھے بھی ساتھ لے گئے، مزنگ چونگی سے گلبرگ کو جاتے ہوئے شادمان چوک پہنچے تو بائیں جانب نکڑ پر ایک مسجد ہے جو پہلے چھوٹی سی مسجد تھی، اب خاصی وسیع ہو چکی ہے۔ اس کے بالکل سامنے سڑک سے دوسری طرف سنٹرل جیل کی ڈیوڑھی تھی جس میں انگریزی عہد کی ہیبت کے تمام عناصر خوف ناک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صورت میں نمایاں تھے قاعدے کے مطابق سنتری بندوق کندھوں پر رکھے ہر آن وہاں کھڑا رہتا تھا۔ مولانا داؤد غزنوی کی آخری سیاسی قید کے تین سال (۹ اگست ۱۹۴۲ء سے ستمبر ۱۹۴۵ء تک) اسی جیل میں گزرے تھے۔ مولانا نے اپنا ملاقاتی کارڈ جیل کے ایک ملازم کے ہاتھ سپرنٹنڈنٹ جیل کو بھیجا۔ وہ باہر آئے۔ مولانا کو نہایت ادب سے جھک کر سلام کیا اور اپنے دفتر لے گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا مولانا کے کہنے پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مولانا ابوالحسنات، شیخ حسام الدین اور شاہ جی کو وہیں بلالیا اور گفتگو کے لیے دفتر کا ایک کمرہ دے دیا گیا۔ مولانا نے ان حضرات کو جیل سے باہر کی صورت حال سے آگاہ کیا اور جس رفتار سے تحریک چل رہی تھی اور گرفتاریاں ہو رہی تھیں، اس کی تفصیل بتائی۔

اب شاہ جی بوڑھے ہو چکے تھے اور جسمانی کمزوری کے آثار ان کے چہرے پر ابھر آئے تھے مگر ان کا دل جوان تھا، جذبات کی دنیا پوری طرح آباد تھی اور کلمۂ حق کہنے کا داعیہ جوبن پر تھا۔ انہوں نے مولانا سے فرمایا، آپ ہماری فکر نہ کریں، ہم بالکل ٹھیک ہیں۔ جیل کی یہ کوٹھڑیاں ہمارے لیے نئی نہیں ہیں، عمر کا بہت بڑا حصہ انہی کوٹھڑیوں میں گزرا ہے۔ ہمیں یہاں کامل اطمینان اور سکون حاصل ہے۔ آپ ہمیں اپنی حالت پر چھوڑ دیجئے اور تحریک جاری رکھیے۔ خود ایسا قدم نہ اٹھائیے کہ گرفتاری تک نوبت پہنچ جائے۔ اگر ایسا ہوا تو تحریک کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ تقریباً ایک گھنٹے تک ان سے ملاقات رہی اور ہم واپس آگئے۔

جب تک تحریک تحفظ ختم نبوت میں گرفتار ہونے والے حضرات لاہور سنٹرل جیل میں محبوس رہے، مولانا داؤد غزنوی کئی مرتبہ ان سے ملاقات کے لیے گئے میں ان کے ساتھ صرف دو مرتبہ گیا۔

تحریک میں حصہ لینے والوں پر حکومت نے بے پناہ سختیاں کی تھیں اور بے شمار لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اخبارات پر سنسر لگا دیا تھا اور مجلس احرار خلاف قانون قرار دے دی گئی تھی۔ پھر ایک تحقیقاتی عدالت قائم کر دی گئی تھی جو جسٹس محمد منیر اور جسٹس ایم۔ آر کیانی پر مشتمل تھی۔ عدالت لاہور ہائی کورٹ میں قائم کی گئی تھی اور تحریک تحفظ ختم نبوت کے بہت سے رہنماؤں کے بیانات قلم بند کیے گئے تھے۔ جنہیں جیل سے پولیس کی تحویل میں لایا جاتا تھا۔ تحریک کی طرف سے مولانا داؤد غزنوی وکیل تھے۔ کمرۂ عدالت لوگوں سے بھر جاتا تھا اور سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے اکثر وکلاء کارروائی سننے کے لیے آتے تھے۔

مرزائیوں کی طرف سے بھی وکیل مقرر تھے۔ شاہ جی کو بیان دینے کے لیے جس دن عدالت میں طلب کیا گیا تھا، لوگوں کا بہت بڑا ہجوم وہاں جمع تھا اور تمام اخباروں کے نمائندے موجود تھے۔ تحقیقاتی عدالت کی پوری کارروائی سنسر کی وجہ سے اخباروں میں نہیں آسکتی تھی، صرف اتنی خبر چھپتی تھی جتنی حکومت دینا مناسب سمجھتی تھی۔

شاہ جی کو جب ہائی کورٹ میں لایا گیا، انکے آگے پیچھے پولیس کے اہلکار تھے، وہ کمرۂ عدالت میں آئے تو شلوار قمیض میں ملبوس تھے اور سر ننگا تھا۔ پہلے بتا چکا ہوں کہ جب سے انہیں پتا چلا تھا کہ جالندھر ریلوے اسٹیشن پر مولانا حسین احمد مدنی کی پگڑی اتار دی گئی ہے، انہوں نے سر سے ٹوپی اتار دی تھی۔ شاہ جی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے اپنے بیان میں مرزائیت کے پس منظر کی وضاحت کی اور پھر تفصیل سے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں اور آپ ﷺ کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے۔ وہ شریعت اسلامی کی رو سے دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ جو لوگ اسکو نبی مانیں اور اس کے لیے ظلی یا بروزی کی اصطلاحیں استعمال کریں یا اس کی مدافعت کریں یا حامیان تحفظ ختم نبوت کو صرف اس وجہ سے اذیت میں مبتلا کریں کہ وہ مرزا غلام احمد اور اس کے ماننے والوں کو کافر قرار دیتے ہیں، میں صاف لفظوں میں اعلان کرتا ہوں کہ میرے نزدیک وہ مسلمان نہیں ہیں۔

شاہ جی نے نہایت جرأت مندانہ انداز میں کہا، جبتک میں زندہ ہوں، یہ اعلان کرتا رہوں گا اور یہ اعلان کرنا اور اس پر قائم رہنا میری زندگی کا نصب العین ہے، جس سے دنیا کی کوئی طاقت مجھے روک نہیں سکتی۔ جو شخص مجھے اس سے روکنے کی کوشش کرے گا، میں اسے مسلمان نہیں سمجھتا، میں اس کی بات ماننے سے انکار کرتا ہوں۔

شاہ جی کا بیان خاصی دیر تک جاری رہا۔ درمیان میں بعض لوگوں نے نعرے لگائے تو عدالت نے نعرے لگانے سے روک دیا۔ خود شاہ جی نے بھی لوگوں سے کہا کہ نعرہ بازی بند کر دیں۔ اگرچہ یہ باقاعدہ عدالت نہیں ہے تحقیقاتی عدالت ہے، تاہم عدالت کا احترام ضروری ہے چاہے وہ کسی بھی نوعیت کی ہو۔ بیان کے بعد عدالت نے حکم دیا کہ جب تک تحریک کے رہنماؤں کے بیانات اور تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے، شاہ جی کو لاہور سنٹرل جیل میں رکھا جائے، ممکن ہے کہ کسی موقع پر عدالت کو انہیں دوبارہ بلانا پڑے۔ (۱)

۲۵، ۲۶ فروری ۱۹۵۶ء کو لاہور میں دلی دروازے کے باہر تحفظ ختم نبوت کانفرنس ہوئی۔ کانفرنس کے آخری اجلاس میں دوپہر کے بعد شاہ جی نے تقریر کی جیل سے رہائی کے بعد لاہور میں ان کی یہ پہلی تقریر تھی جو تین گھنٹے جاری رہی۔ بہت بڑے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے عقیدۂ ختم نبوت اور تحریک تحفظ ختم نبوت کی وضاحت کی۔ لیکن اب ضعف و نقاہت نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ وہ مسلسل چالیس بیالیس برس تک لوگوں کے جذبات و احساسات کو الفاظ و حروف کے قالب میں ڈھالتے رہے تھے، مگر اب ان میں وہ کس بل نہ رہے تھے۔ نہ اب برطانوی حکومت ان کی حریف تھی جس کی ستم گری کے بوقلموں واقعات سے ان کو پرتاثیر جملوں اور نوع بنوع فقروں کا ذخیرہ میسر آتا تھا، نہ کوئی سیاسی طاقت ان کے مدمقابل رہی تھی، جس پر تنقید کرتے ہوئے وہ نئے سے نئے اسلوب کلام اور مؤثر ترین انداز بیان سے حاضرین کو تڑپاتے

۱۔ شاہ جی نے اپنے رفقاء کو اس تحقیقاتی عدالت کے بائیکاٹ کا مشورہ دیا تھا مگر دوستوں کے فیصلے پر عدالت میں مجبوراً بیان دینے چلے آئے۔ وہ شروع دن سے اس موقف پر قائم تھے کہ یہ عدالت اسلام اور مسلمانوں کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے قائم کی گئی ہے۔ پھر تاریخ شاہد ہے کہ پاکستان کی عدالتی تاریخ میں جانبداری اور بددیانتی کی بنیاد جسٹس منیر نے رکھی۔ اور وہ فیصل بننے کی بجائے قادیانیوں کے وکیلِ صفائی بن گئے۔ اسلام اور علماء کو ذلیل و رسوا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ جسٹس کیانی بھی ان کے شریک تھے۔ انہوں نے تحریک تحفظ ختم نبوت کو سیاسی رنگ دے کر "احرار احمدی نزاع" کا نام دیا مگر محمد مصطفیٰ ﷺ کے ناموس کی شرم نہ کی تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ خود اس پر شاہدِ عدل ہے (مدیر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور گرماتے تھے۔ اگرچہ ان کا لہجہ پژمردہ ہو چکا تھا اور زور خطابت ماند پڑ گیا تھا، تاہم جذبات و جوش میں تلاطم بدستور موجود تھا۔

اس تقریر میں شاہ جی نے مولانا داؤد غزنوی کے بارے میں بعض ایسی باتیں ارشاد فرمائیں جو ہمارے جیسے ادنیٰ عقیدت مندوں کے نزدیک ان کی شان پروقار سے ہم آہنگ نہ تھیں۔ لیکن یہ کسی خاص تاثر کی بناء پر ایک بڑے آدمی کا ایک بڑے آدمی اور پرانے ساتھی کے متعلق اظہار خیال تھا، جس سے ان لوگوں کو کوئی خاص تعلق نہ تھا، جو دونوں بزرگوں کو ہر صورت میں لائق تکریم گردانتے تھے۔

جلسہ گاہ میں میں نے دیکھا کہ چند نوجوان چار پانچ کتابچے تقسیم کر رہے ہیں۔ ان میں ایک نوجوان میرے پاس آیا اور کتابچے دے کر آگے نکل گیا۔ میں نے دیکھے تو وہ کتابچے میرے ہی دو اداریوں پر مشتمل تھے جو میں نے "الاعتصام" میں لکھے تھے۔ سولہ سولہ صفحات کے یہ کتابچے میرے نام سے چھپے تھے اور تحفظ ختم نبوت ملتان نے شائع کیے تھے۔

اس کی مناسب تفصیل تو ان شاء اللہ اس مضمون میں بیان کی جائے گی جو میں کسی وقت سید ابوالاعلیٰ مودودی پر لکھنا چاہتا ہوں لیکن یہاں مختصر الفاظ میں عرض کروں گا کہ ۱۵ مئی ۱۹۵۵ء کو مولانا مودودی مرحوم نے برکت علی ہال (لاہور) میں جمعیت حدیث کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے صحیح بخاری کے بارے میں ایسے الفاظ ارشاد فرمائے تھے جو اہل سنت کے نقطۂ نظر سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ میں نے "الاعتصام" میں (جس کا میں اس زمانے میں ایڈیٹر تھا) اس کا نوٹس لیا تو جماعت اسلامی کے حلقوں میں شدید رد عمل ہوا اور اس کے تمام رسائل و جرائد میدان میں نکل آئے۔ طرفین میں ایک "صحافتی جنگ" شروع ہو گئی اور پھر یہ جنگ اسی ایک محاذ میں محدود نہ رہی بلکہ اپنی فطرت کے مطابق بہت سے محاذوں میں پھیل گئی اور متعدد حضرات نے اس میں حصہ لیا۔ ۱۷ جون ۱۹۵۵ء کو مولانا مودودی نے سرگودھا میں تقریر کی تو اس میں بھی بعض عجیب و غریب باتیں ارشاد فرمائیں۔ میں نے اس سے "الاعتصام" کی دو اشاعتوں --- ۱۵ جولائی اور ۲۲ جولائی ۱۹۵۵ء --- میں اظہار اختلاف کیا۔ عنوان تھا "لاہور کے بعد سرگودھا --- راہ اعتدال یا راہ اعتزال" تحفظ ختم نبوت ملتان نے ایک کتابچے کی صورت میں اسے "راہ اعتدال یا راہ اعتزال" کے نام سے شائع کیا۔

مولانا مودودی نے سورۃ المومنون کی ابتدائی آیات کی تفسیر کرتے ہوئے (ترجمان القرآن اگست ۱۹۵۵ء میں) بعض تعجب انگیز باتیں تحریر فرمائی تھیں۔ میں نے "الاعتصام" کے ۴ نومبر اور ۱۱ نومبر ۱۹۵۵ء کے اداریوں میں "متعہ کے جواز پر ڈرامائی استدلال" کے عنوان سے اس کے بارے میں لکھا۔ اسے بھی کتابچے کی شکل میں تحفظ ختم نبوت ملتان نے شائع کیا ان دونوں کی اشاعت کا علم مجھے اسی جلسے میں ہوا جو ۲۵، ۲۶ فروری ۱۹۵۶ء کو دلی دروازے کے باہر لاہور میں ہوا تھا اور جس کے آخری اجلاس میں شاہ جی نے تقریر کی تھی۔

۱۹۵۶ء کے مارچ کی ابتدائی تاریخوں میں شاہ جی لاہور میں تھے اور مجلس احرار کے دفتر (بیرون دلی دروازہ) میں قیام فرما تھے۔ ایک دن دس بجے کے قریب مولانا مجاہد الحسینی دفتر "الاعتصام" میں تشریف لائے اور مولانا داؤد غزنوی سے ملے۔ میں اس وقت مولانا کی خدمت میں حاضر تھا۔ اس زمانے میں بعض معاملات سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

متعلق کچھ لوگوں نے شاہ جی اور مولانا غزنوی کے درمیان کچھ غلط فہمیاں پیدا کر دی تھیں، جن کا شاہ جی نے چند روز بیشتر ۲۶ فروری کی تقریر میں اپنے انداز خاص میں ذکر کیا تھا۔ مولانا اپنے پرانے ساتھی سے اس کی امید نہیں رکھتے تھے، اس لیے انہیں شاہ جی سے اس ضمن میں دوستانہ شکوہ تھا۔ مولانا مجاہد الحسینی چاہتے تھے کہ مولانا تکلیف فرمائیں اور شاہ جی کے پاس تشریف لے جائیں تاکہ باہمی گفتگو سے غلط فہمیاں دور ہو جائیں، مگر مولانا اس پر آمادہ نہ تھے۔ وہ فرماتے تھے، پہل شاہ جی کی طرف سے ہوئی ہے، ازراہ کرم وہ تشریف لائیں اور اپنا نقطۂ نظر واضح فرمائیں۔ میں بھی انہیں اپنا مؤقف بتاؤں گا۔ اگر میری غلطی ہوئی تو معافی مانگ لوں گا۔

خاصی دیر تک گفتگو ہوتی رہی، بالآخر مولانا نے فرمایا کہ میں اپنے ایڈیٹر (یعنی اس راقم عاجز) کو اپنا نمائندہ بنا کر آپکے ساتھ شاہ جی کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ یہ ان سے میرے مؤقف کی وضاحت کریں گے اور پھر اگر ضرورت ہوئی تو میں خود ان کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔

مولانا مجاہد الحسینی نے یہ تجویز منظور فرمائی اور میں مولانا کی نمائندگی کے لیے انکے ساتھ روانہ ہو گیا۔ مجھے احساس تھا کہ میں مولانا کی نمائندگی کا حق ادا نہیں کر سکوں گا اور شاہ جی کے حضور کھل کر بات کرنا میرے لیے مشکل ہو گا، لیکن اس کے باوجود میں چل پڑا۔

اس دن ہلکی ہلکی سی بارش ہو رہی تھی۔ مجلس احرار کا دفتر دلی دروازے کے باہر سرکلر روڈ پر شاہ محمد غوث کے مزار کے سامنے کی بلڈنگ کی دوسری اور تیسری منزل میں تھا۔ بارش کی وجہ سے سڑک پر گارے کی موٹی موٹی تہیں جمی ہوئیں تھیں۔ اسی بلڈنگ میں احرار کے ترجمان روزنامہ "آزاد" کا دفتر تھا، جس کے ایڈیٹر ان دنوں مولانا مجاہد الحسینی تھے۔ ہم دوسری منزل میں گئے تو ایک بڑے کمرے میں موٹے بان کی چھوٹی سی چارپائی پر برصغیر کا شہنشاہ خطابت آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ فرش پر ایک بڑی سی دری بچھی ہوئی تھی جو کئی جگہ سے پھٹی ہوئی تھی اور اس کے بڑے بڑے سوراخ اس کی بوسیدگی اور کہنگی کا اعلان کر رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ یہ عمر کی بہت سی منزلیں طے کر چکی ہے اور اس پر بے شمار کاروانِ احرار گزر چکے ہیں۔

دری پر سات آٹھ آدمی چپ چاپ بیٹھے تھے اور شاہ جی نظر کی عینک لگائے اور ہڈیوں کا ڈھانچہ بنے مجلس احرار کے لیٹر پیڈ پر کچھ لکھ رہے تھے اور نگاہیں کاغذ پر جمی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں ان کے انہماک کو دیکھ کر "سرہانے میر کے آہستہ بولو" کی عملی تصویر بنے ہوئے تھوڑا سا آگے بڑھے۔ جوتے اتار کر اور بزبان خفی السلام علیکم کہہ کر، نہایت ادب سے دوزانو ہو کر دری پر بیٹھ گئے کچھ دیر بعد شاہ جی نے کاغذ پر سے نگاہ اٹھائی تو میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر مؤدبانہ اور نیازمندانہ سلام عرض کیا اور گردن جھکا کر دونوں ہاتھ ان کے بابرکت ہاتھوں میں دے دیئے۔ مولانا مجاہد الحسینی نے کھڑے ہو کر میرا ان سے تعارف کرایا۔

ان پاک طینت لوگوں کو ہمیشہ کیلئے دھرتی نگل گئی ہے اور اس کھنڈے کے لوگ اب کبھی سطحِ ارض پر نمودار نہیں ہوں گے۔ افسوس ہے

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میرا نام (جو ان جیسے نامور حضرات کے ذکر کے مقابلے میں کسی شمار قطار میں آنے کے لائق نہیں) سنتے ہی بیسویں صدی کے برصغیر کا خطیب اعظم چارپائی سے اٹھا اور مجھے اپنی بغل میں لے لیا۔ مولانا مجاہد الحسینی سے کہا تم خاموشی سے آکر بیٹھ گئے، آتے ہی کیوں نہیں بتایا میں اپنے عزیز کو لینے کے لیے دروازے پر جاتا۔ یہ الفاظ مجھ فقیر کے لیے بہت بڑا اعزاز تھے۔ پھر اس سے بڑا اعزاز یہ کہ مجھے اپنے برابر چارپائی پر بٹھایا عجیب تر بات یہ کہ اصرار کر کے سرہانے کی طرف بٹھایا اور جو بڑا سا تکیہ چارپائی پر پڑا تھا، ٹیک لگانے کے لیے عنایت فرمایا۔ میں اس پیکر شفقت کی پر خلوص باتیں سن کر اور کیفیت انکسار دیکھ کر مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا۔ ایک آدھ منٹ تو کسی نہ کسی طرح سرہانے کی طرف بیٹھا، پھر یہ عرض کر کے پائنتی میں آگیا کہ اب تعمیلِ ارشاد ہو گئی اور

الامر فوق الادب

پر عمل کر لیا گیا ہے۔

شاہ جی نے لطف و کرم کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: میں آپ کے اخبار "الاعتصام" کا باقاعدہ مطالعہ کرتا ہوں، آپکے اداریے پڑھتا ہوں اور خوش ہو کر آپ کو دعا دیتا ہوں۔ آپکے دو اداریے تو میں نے مجلس تحفظِ ختم نبوت[1] ملتان کی طرف سے کتابی صورت میں شائع بھی کرائے ہیں جن میں سے ایک کا عنوان "راہ اعتدال یا راہ اعتزال" اور ایک کا "متعہ کے جواز پر ڈرامائی استدلال" ہے پھر یہ دونوں کتابچے مجھے عنایت فرمائے۔

اس کے بعد انہیں مولانا داؤد غزنوی کا سلام پہنچایا گیا۔ مولانا مجاہد الحسینی نے کہا۔ مولانا سے بہت سی باتیں ہوئی ہیں، وہ کسی وجہ سے خود تشریف نہیں لاسکے، میرے متعلق بتایا کہ یہ ان کے نمائندے کی حیثیت سے آپ سے بات کریں گے۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک مجھے شاہ جی کی خدمت میں حاضر رہنے اور ان کے ارشادات سے مستفید ہونے کا شرف حاصل رہا۔ تمام گفتگو میں انہوں نے یا تو مجھے "اسحاق صاحب" کہہ کر خطاب فرمایا یا "میرے عزیز" کہہ کر۔۔۔! جمال و انکسار میں ڈوبے ہوئے لہجے میں انہوں نے کہا: میں فقیر آدمی ہوں، مولانا داؤد غزنوی سے خفا ہونے اور ان سے گلے شکوے کا تصور بھی نہیں کر سکتا، میں امرتسر کی ایک مسجد میں بیٹھا زندگی کے دن گزار رہا تھا اور اپنے تھوڑے سے علم کے مطابق وعظ و نصیحت کی خدمات انجام دے رہا تھا کہ ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت شروع ہو گئی۔ داؤد غزنوی مجھے جانتے تھے اور میرے طریق وعظ کا انہیں علم تھا۔ میں نہایت سادگی سے رہتا اور کھدر کا نیلے رنگ کا تہبند باندھتا تھا۔ اُن کا گھرانہ فضل و کمال اور تصوف و طریقت کا گھرانہ تھا جس کے فیوض و برکات کا دائرہ سارے پنجاب پر محیط تھا۔ ان سے ملاقات ہوتی تو نہایت مہربانی کا اظہار کرتے، میں بھی جھک کر سلام کرتا، ان کی جوانی کا زمانہ تھا، میں بھی جوان تھا، لیکن ان کا شمار اس دور کی مجلس خلافت

۱۔ ان دنوں مجلس احرار اسلام خلافِ قانون تھی اور احرار کارکن شاہ جی کی قیادت میں احرار کے شعبۂ تبلیغ "مجلس تحفظ ختم نبوت" کے نام سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ بعد میں مولانا محمد علی جالندھری رحمہ اللہ نے اسے مستقل جماعت بنا کر احرار سے علیحدگی اختیار کر لی۔ (مدیر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے قائدین میں ہوتا تھا اور میں گوشہ نشین امام مسجد تھا۔ ایکدن انہوں نے مجھ سے کہا: کیوں مسجد میں بیٹھے اپنی صلاحتیں صائع کر رہے ہو، اٹھو میدان عمل میں نکلو، ملک اور قوم کو تمہاری ضرورت ہے۔ میں ان کے کہنے سے مسجد کی چار دیواری سے باہر نکلا اور تحریک خلافت میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ میانوالی جیل میں ہم دونوں اکٹھے رہے اور بارہا جیل اور ریل میں ہماری رفاقت رہی۔ تحریک خلافت میں جمعیت علمائے ہند (جس کے بانیوں میں خود داؤد غزنوی کا نام بھی شامل ہے) مجلس احرار میں اور بعض دوسری سیاسی جماعتوں میں ہم نے ایک ساتھ کام کیا، ایک سٹیج پر تقریریں کیں اور بے شمار مواقع پر ہمسفر رہے۔

شاہ جی نے فرمایا، میں سیاست میں ان کو اپنا استاد سمجھتا ہوں اور استاد کا گلہ کرنا اس فقیر کا شیوہ نہیں۔ میری جوانی گزر گئی، کھولت کا زمانہ بیت گیا، اب بڑھاپے کی منزل میں داخل اور قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں، میں ہر گز اس سید زادے سے خفا نہیں۔ یہ میرا اللہ کرنے کا وقت ہے، گلے شکوے کی کتاب کھول کر بیٹھنے کا نہیں، اسحاق صاحب! میرا انہیں نیاز مندانہ سلام پہنچایئے اور میری طرف سے عرض کیجئے کہ وہ میرے بہت پرانے ساتھی ہیں، مجھ گنہگار کے لیے دعا کریں، میں بھی انکے لیے دعا گو ہوں، میں ان کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے آپ کو میرے پاس بھیجا۔ آپ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس فقیر کے پاس آنے کی زحمت گوارا کی۔

شاہ جی نے اس قسم کی اور بھی بہت سی باتیں کیں۔ ان کا لہجہ انتہائی نرم اور طرز کلام بدرجہ غایت میٹھا اور پیارا تھا۔ اثنائے گفتگو میں کئی دفعہ ان کی آنکھوں میں آنسو آئے اور زبان کے طرز اداء نے ان کی کیفیت قلب کا پتا دیا۔

زندگی میں میری ان سے یہ پہلی اور آخری گفتگو تھی، جو بہت سی گفتگوؤں پر بھاری تھی۔ اس میں شاہ جی نے اپنے دل کا صاف و شفاف آئینہ میرے سامنے رکھ دیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ گفتگو تاثر پذیری کے بے شمار نقوش میری لوح قلب پر مرتسم کر گئی۔ میں نے واپس آ کر مولانا کو باتیں تفصیل سے سنائیں اور شاہ جی نے ان کے بارے میں جن جذبات کا اظہار کیا تھا، ان کی وضاحت کی۔ ظاہر ہے خود مولانا بھی اپنے متعلق شاہ جی کے تاثرات معلوم کرنے کے لیے بے تاب تھے اور میرا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے یہ باتیں غور اور توجہ سے سنیں اور دوران سماعت کئی مرتبہ اشکبار ہوئے۔ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ بات چیت سے شاہ کی افسردگی کا اندازہ ہوتا تھا اور سننے والے بھی افسردہ تھے کیفیت یہ تھی کہ ع۔

افسردہ دل، افسردہ کند انجمنے را

شاہ جی کی جسمانی حالت اور نرمیٔ کلام کو دیکھ کر داغ کا یہ شعر ذہن میں گھوم رہا تھا۔

ہوش و حواس و تاب و تواں داغ جاچکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں، ساماں تو گیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شاہ جی برصغیر کے بے مثال خطیب اور عظیم مجاہد تھے بقول کسے "قرآن مجید پڑھتے تو معلوم ہوتا کہ قرأت و تجوید کے تمام لوازم کے ساتھ لحن داؤدی سے سرفراز کر دیے گئے ہیں۔

وہ غلامی کے دور میں پیدا ہوئے اور غلامی کے شر میں خیر کا پہلو یہ پنہاں تھا کہ اس خطہ ارض نے بڑے بڑے لوگوں کو جنم دیا، جن میں شہرۂ آفاق سیاستدان بھی تھے اور اونچے درجے کے مقرر و خطیب بھی منجھے ہوئے اصحاب درس و تدریس بھی تھے اور عالی مرتبے کے مصنف و مؤلف بھی پاکیزہ وش صوفیا و اتقیا بھی تھے اور اہل تحقیق مناظر و ناقد بھی یہ حضرات ایک خاص فضا اور ماحول کی پیداوار تھے۔ اب ان اوصاف کے حامل لوگ کبھی پیدا نہیں ہوں گے۔ وہ سانچے مدت ہوئی ٹوٹ گئے جن میں یہ حضرات ڈھلے تھے اور وہ دور عرصہ ہوا ختم ہو گیا جس میں یہ بزرگ عالم وجود میں آئے تھے۔

شاہ جی اپنے گوناگوں کمالات کی وجہ سے ان لوگوں میں اپنا خاص مقام رکھتے تھے، بلکہ کہنا چاہیے کہ صف اول میں جگہ پاتے تھے۔ ان کی تقریر میں شیر کی گرج، خطابت میں دریا کی روانی اور تنقید میں تلوار کی کاٹ تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان میں ایک اور خصوصیت بھی تھی۔ ان کی زبان کی جنبش میں پھولوں کی مہک اور گلاب کی خوشبو بھی رچی ہوئی تھی۔

وہ انتہائی نرم گفتار بھی تھے اور بدرجۂ غایت تیز کلام بھی۔ انگریزی حکومت کے خلاف لب کشائی کرتے تو زبان آگ اگلنے لگتی، اور توحید و سنت کے موضوع پر وعظ کہتے تو لہجہ بدل جاتا اور نرمی اور ملائمت کا پیکر شیریں بن جاتے۔ وہ سحر طراز خطیب اور شیوہ بیان مقرر تھے۔ جو بات کرتے، اخلاص میں ڈوب کر کرتے اور وہ بات سامعین کے دل کی گہرائیوں میں اترتی اور اپنی جگہ بناتی چلی جاتی۔ جس مسئلے کو موضوع بحث ٹھہراتے، اس کے متعلقات کی اس اسلوب میں وضاحت کرتے کہ حاضرین پر جادو کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ وہ چھے چھے سات سات گھنٹے بے تکان بولتے اور دریا کی سی روانی سے بولتے۔ جب تک تقریر کا سلسلہ جاری رہتا، ایسے محسوس ہوتا کہ فضا پر نور کی چادر تنی ہوئی ہے۔ وعظ و تقریر میں ایسے ایسے لطائف و ظرافت اور واقعات و حکایات بیان کرتے کہ کبھی محفل کشت زعفران بن جاتی اور کبھی آہ و بکا کی صدائیں بلند ہونے لگتیں۔ مجمع پوری طرح ان کی گرفت میں ہوتا، وہ ہنساتے بھی تھے اور رلاتے بھی تھے۔ اردو فارسی اور پنجابی کے بے شمار اشعار انہیں یاد تھے۔ موقع و محل کی مناسبت سے اس انداز میں شعر پڑھتے کہ معلوم ہوتا شاعر نے اسی مقام کے لیے شعر کہا تھا۔

انہوں نے جگر داری کے ساتھ انگریز سے ٹکر لی، بہادری اور حوصلے کے ساتھ قید و بند کی سختیوں کو جھیلا اور جرأت و بے باکی سے حریف طاقتوں کا مقابلہ کیا۔ ان کی عزیمت ان کی عظمت کا پتا دیتی ہے، ان کا ایثار ان کی بلندی کی نشاندہی کرتا ہے اور ان کی درویشی ان کی رفعت کو اُجاگر کرتی ہے۔

اگر وہ اپنی خداداد قابلیتوں کی بناء پر پیری مریدی کی راہ اپناتے تو لاکھوں ہاتھ انکی بیعت کے لیے آگے بڑھتے اور انسانوں کے گروہ کے گروہ قدم بوسی کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتے۔ اگر دنیوی مال و منال کی طرف عنان توجہ مبذول کرتے تو اپنی جاذبِ قلب و نظر شخصیت کی بناء پر عوامی محبوبیت کا مرکز قرار پاتے اور سیم وزر کے اونچے اونچے ڈھیر ان کے سامنے ہوتے۔

انہوں نے آرام و راحت کے بجائے تکلیف و اذیت کی راہ اپنائی اور اس وقت انگریز کے قلعہ اقتدار میں شگاف ڈالنے کے لیے میدان میں اترے، جب اس کے خلاف زبان سے کوئی لفظ نکالنا اپنے آپ کو بے پناہ مصائب کے سپرد کر دینے کے مترادف تھا، انہوں نے اس دور میں سلطان جائر کے سامنے آزادی و حریت کا کلمۂ حق بلند کیا، جب اس کے صلے میں طوق و سلاسل کی گراں باریوں کو انگیز کرنا لازمی قرار پایا تھا۔ انہوں نے تحریک ہجرت میں حصہ لیا، تحریک خلافت میں قربانیاں دیں اور پھر اس محاذ پر دادِ شجاعت دی جس سے انگریز کے پندارِ استعمار کو گزند پہنچ سکتا تھا۔ بلاشبہ انکی سیاسی خدمات کا سلسلہ بہت طویل اور انتہائی درد ناک ابواب پر مشتمل ہے۔

مجلس احرار کے قیام کے بعد، جس کے بانیوں میں خود شاہ جی بھی تھے، وہ زندگی کے آخری لمحوں تک مجلس احرار سے وابستہ رہے۔ اس میں یا تو درمیانے درجے کے لوگ شامل تھے یا غریب و نادار۔! میرے خیال میں اس جماعت میں صرف ایک چودھری، ایک نواب زادہ اور ایک صاحب زادہ تھے۔ جب کہ بعض دوسری سیاسی جماعتوں میں نوابوں اور نواب زادوں اور صاحب زادوں اور چودھریوں اور سیٹھوں اور خان بہادروں اور سرکاری خطاب یافتوں کی لائنیں لگی ہوئی تھیں۔

احرار کے نواب زادہ اور صاحب زادہ (نواب زادہ نصر اللہ خاں اور صاحب زادہ فیض الحسن) کو میں نے مجلس احرار کے مرکزی دفتر لاہور میں پہلی مرتبہ ۱۹۴۷ء میں اس وقت دیکھا تھا، جب صوبہ بہار میں فسادات کا زور تھا۔ اور ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا۔ اور غریب مجلس احرار کے قائم کردہ جہاد فنڈ میں غریب لوگ چندہ جمع کراتے تھے۔ میں بھی اپنے وطن کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ۔ مشرقی پنجاب) کے غریب مسلمانوں کی طرف سے تین سو ساٹھ روپے کی غریبانہ رقم جمع کرانے کے لیے مجلس احرار کے دفتر (لاہور) آیا تھا۔ مجھے یاد ہے اس رقم کی رسید ثناء اللہ بھٹہ نے دی تھی اور انہی کے اس پر دستخط تھے۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ مجلس احرار کے چودھری (افضل حق) جو بے چارے فقط نام کے چودھری تھے ۱۹۴۲ء میں وفات پاگئے اور آزادی کے فوراً بعد نواب زادہ (۱) اور صاحبزادہ دونوں اس جماعت سے الگ ہوگئے، اور یہ جماعت بدستور قلندروں اور ملنگوں (۲) کی جماعت رہی۔ لیکن مجلس احرار کے یہ قلندر اور ملنگ اور درمیانے درجے کے لوگ ایثار اور قربانی کا مجسمہ تھے۔ آزادی وطن کے لیے عمل و حرکت کو عبادت قرار دیتے تھے اور اس سلسلے میں قید و بند کے لیے ہر وقت آمادہ و تیار رہتے تھے۔

ستمبر ۱۹۳۹ء سے دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو احرار سینہ تان کر میدان میں آگئے۔ ملک کی

۱۔ نوابزادہ ۱۹۵۶ء میں اور صاحبزادہ ۱۹۵۳ء میں احرار سے علیحدہ ہوئے۔ (مدیر)

۲۔ یوں کہنا چاہیے کہ مجلس احرار فقیروں اور درویش خدامستوں کی جماعت تھی۔ "قلندری" اور "ملنگی" تو مستقل مذہب ہے جو ایرانی سبائیوں اور رافضیوں کی ایجاد ہے۔ (مدیر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انگریزی حکومت کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور گرفتار کر لیے گئے۔ ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو جب کانگریس نے بمبئی میں "ہندوستان خالی کرو" ریزولیوشن پاس کیا تو اس کے نتیجے میں رہنماؤں اور بہت سے کارکنوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ لیکن مجلس احرار کے قائدین و ارکان اس وقت جنگ کے بعد دوسری مرتبہ گرفتاریاں پیش کر رہے تھے۔ مجھے یاد ہے اس صورت حال کے متعلق سبھاش چندر بوس نے کانگریس پر طنز و طعن کے انداز میں ایک بیان میں کہا تھا کہ "مجلس احرار کے ارکان کانگریسی نیتاؤں سے قربانی میں کہیں آگے ہیں جو آزادیٔ وطن کے لیے تین سال کے عرصے میں حکومت برطانیہ کے خلاف سول نافرمانی کر کے دوسری مرتبہ جیلوں میں جا رہے ہیں"۔

مجلس احرار سے تعلق رکھنے والوں کو شاید جیل جانے کا "مرض" لاحق ہو گیا تھا۔ جیل سے باہر کھلی فضا میں رہنا ان کو راس نہیں آتا تھا۔ دو ڈھائی مہینے باہر رہتے تو انہیں کھجلی سی ہونے لگی، اس کا علاج ان کے نزدیک جیل جانا تھا۔

اس موقعے پر مجھے مشہور صحافی دیوان سنگھ مفتون کی آزادی سے پہلے کی ایک بات یاد آ رہی ہے۔ انکا اخبار ہفت روزہ "ریاست" تھا جو ملک کے بعض حلقوں میں دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ اس کا ایک کالم سوال و جواب تھا۔ کسی نے ان سے ملک کی مختلف سیاسی جماعتوں اور ان کے عمائد و ارکان کی خصوصیات کے بارے میں سوال کیا، جن میں مجلس احرار بھی شامل تھی۔ انہوں نے تمام جماعتوں کے بارے میں جواب دیا اور ان کا دلچسپ اسلوب میں تجزیہ کیا۔ مجلس احرار کے ارکان کے بارے میں ان کا جواب تھا کہ یہ ملک کی وہ سیاسی جماعت ہے، دھواں دھار تقریریں کرنا جس کے لیڈروں کا پیشہ ہے۔ وہ انگریزی حکومت کے بھی خلاف ہیں، ہندوؤں کے مخالف ہیں، کانگریس سے بھی ان کا تصادم ہے اور مسلم لیگ سے بھی چپقلش ہے۔ یہ لوگ سادہ زندگی بسر کرتے ہیں، جلسوں میں جائیں تو معمولی ہوٹل یا تنور سے دال روٹی کھا کر گزارہ کرتے ہیں۔ جیل سے باہر رہنا ان کے لیے ناممکن ہے۔ کوئی نہ کوئی ایسا سلسلہ شروع کیے رکھتے ہیں، جن کے باعث جیل جانا ضروری ہو جائے۔

برصغیر کو انگریزی استعمار سے نجات دلانے کے لیے شاہ جی نے جو جدوجہد کی وہ آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہے۔ آزادی کی ہر تحریک کا طویل پس منظر ہوتا ہے، جس میں بہت سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں، ہر دور میں متعدد جماعتیں اپنے اپنے انداز سے حصول آزادی کے لیے کوشاں رہتی ہیں اور مختلف عناصر اس کے لیے تگ و دو کرتے ہیں۔ پھر ان سب کی مخلصانہ کوششوں سے آزادی کی نعمت میسر آتی ہے۔

شمع حریت کبھی کسی ایک ہی سمت سے صحن ملک میں داخل نہیں ہوتی۔ مختلف اوقات و حالات میں مختلف سمتوں اور مختلف دروازوں اور ذریعوں سے آتی اور چمن زار وطن کو روشنی بخشتی ہے۔ اگر بعض عناصر اس چند لفظی تجزیے کو اپنی سیاسی عصبیت کی بھینٹ نہ چڑھا دیں تو ہم عرض کریں گے کہ آزادیٔ وطن اور قیام پاکستان میں مجلس احرار کی قربانیوں اور شاہ جی کی تگ و تاز مجاہدانہ کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جماعتوں کے ارباب قیادت کی سعی مسلسل سے ہم نے انگریز کی غلامی سے چھٹکارا پایا اور انہی کی قربانیوں کی بدولت ہم حریت و آزادی کے مسرت آمیز دور میں داخل ہوئے۔

بعض حضرات نے طعن و تنقید کو اپنا مشن قرار دے رکھا ہے اور اسی پر انکا گزارہ ہے تنقید بہت آسان کام ہے، ذمے داریوں سے بچنے اور اصل کام سے دور رہنے کے لیے تنقید سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ شاہ جی اور ان کی جماعت کو بھی وہ ہدف تنقید ٹھہراتے ہیں اور یہ ان کے نزدیک ملک و ملت کی بہت بڑی خدمت ہے۔

شاہ جی اور چھوٹے بڑے تمام قائدین احرار میں یہ خوبی تھی کہ ہر آن اور ہر حال میں خوش و خرم رہتے تھے لطیفے بازی اور ہنسی مذاق ان کی زندگی کا لازمی جزو تھا۔ اس پر ان کی مخالف سیاسی جماعتوں کے بعض لوگ طعنہ زن بھی ہوئے، مگر انہوں نے اسکی پروا نہیں کی۔

یہ حقیقت ذہن میں رکھنی چاہیے کہ احرار ہمیشہ برصغیر کی انگریزی حکومت کے معتوب رہے اور بعض سیاسی جماعتوں نے بھی انہیں پریشانیوں میں مبتلا کیے رکھا اور ان پر کئی قسم کے الزام عائد کیے۔ پھر انکے مادی وسائل بھی بہت محدود تھے اور بعض افراد تو مفلسی کی حالت میں تھے۔ اگر ان میں لطیفے بازی کی حس نہ ہوتی اور یہ لوگ ہنسی مذاق سے آشنا نہ ہوتے، ہر وقت ماتھے پر تیور چڑھائے اور اپنے آپ پر سنجیدگی طاری کیے رکھتے تو ان کا زندہ رہنا مشکل ہوجاتا۔ انہوں نے ہمیشہ ہنسی مذاق اور لطائف و ظرائف میں غم غلط کرنے کی کوشش کی، اور ان حالات میں ان کے لیے یہ ضروری بھی تھا تکلیفوں اور مصیبتوں کے احساس کو کسی نہ کسی حد تک دور کرنے کے لیے اس قسم کا اسلوب اختیار کرنے کو میرے خیال میں نامناسب نہیں قرار دیا جاسکتا، بلکہ اسے مارشل لاء کی قانونی بولی میں "نظریۂ ضرورت" سے تعبیر کرنا چاہیے یا ہماری عام زبان میں "امر مجبوری" کہہ لیجیے۔

شاہ جی نہایت حاضر جواب تھے۔ ایک دفعہ وہ کہیں تقریر کر رہے تھے کہ کسی نے ان سے سوال کیا: آپ کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ کا درجہ بلند ہے یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا۔۔؟ جواب دیا: حضرت علیؓ میرے آقا حضرت مصطفیٰ ﷺ کے مرید ہیں، اور حضرت عمرؓ آپ ﷺ کی مراد۔! مجھے میرے نانا کے مرید اور مراد دونوں سے محبت ہے اور ان سے اظہار محبت کرنا میرا جزوِ ایمان ہے"۔

ایک مرتبہ رمضان المبارک سے ایک دن پہلے ایک نوجوان نے ان سے کہا: شاہ جی۔! شدید گرمیوں کا موسم ہے اور کل سے روزے شروع ہو رہے ہیں۔ کوئی ایسا مسئلہ بتائیے کہ کھایا پیا بھی جائے اور روزہ بھی نہ ٹوٹے۔

فرمایا: کل روزہ رکھ کر میرے پاس آجانا میں تمہیں جوتے ماروں گا، تم جوتے کھاتے جانا اور آنسو پیتے جانا۔ کھاتے پیتے بھی رہوگے اور روزہ بھی نہیں ٹوٹے گا۔

شاہ جی نے اور ان کی جماعت مجلس احرار نے تحریک پاکستان سے اختلاف کیا تھا لیکن جب پاکستان

© rasailojaraid.com